کرتے، لیکن ہمیں خبر نہ لگتی۔

75۔ جی میں سب سے بڑا واقعہ ''دھوپ سائے'' فلم تھی۔ پتہ نہیں انہیں فلم بنانے کی کیونکر سوجھی۔ اندر ہی اندر سوچتے رہتے کہ پاکستان میں جاگرتی کرانا اور عوام کو پاکستان سے محبت کے لیے تیار کرنا ہے۔ اس فلم کی بنیادی تھیم بھی یہی تھی کہ یہاں منافع خوروں کے خود غرض طبقے نے دولت کمانے کے ہتھکنڈے اور راستے تلاش کر لیے ہیں۔ آفتاب احمد جعلی ادویات بناتا ہے اور اُس کے ہاتھوں کئی مریض مر آخر میں جب انجام کار وہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے تو اُس کے ہونٹوں پر یہ الفاظ رہ جاتے ہیں ''کوئی گولی کوئی نہیں۔ یہ تو سیفر کردار تک پہنچنے کی پاداش میں ہے۔''

اس فلم میں قوی نے شرابی، منور توفیق نے تائب طوائف، عطیہ نے بیزر بچے کی ماں کا رول کیا ان ایکٹروں سے ضرور واقف ہوں گے کیونکہ انہوں نے اپنے عہد میں بڑی شہرت حاصل کی۔

نیکی اور بدی کا جو گہرا تعلق ہے اور معاشرہ ان کے نرغے میں جس طرح آیا رہتا ہے ''دھوپ سائے'' بڑی اچھی مثال تھی۔ قوی شرابی اور منور توفیق تائب طوائف ہے جو بچوں کو قرآن شریف پڑھاتی ہے۔ یہ دو کے راندہ درگاہ ہیں۔ دوسری جانب آفتاب احمد جو سوسائٹی میں دولت کی وجہ سے بہت عزت دار ہے۔ اپنائیں۔ یہاں خاں صاحب نے منٹو اور مفتی جی کی طرح طوائف اور شرابی کی بڑی طرف داری کی ہے۔

اس فلم میں جب زہرہ تائب ایک درخت تلے بیٹھی گا رہی ہے۔

''شام شہر ہوں میں شمعیں جلا دیتا ہے تو''

تو کٹڑی کا ایک بزعم خود شریف آدمی خنزر والے سے پوچھتا ہے ''بول ری آپا زہرہ کون ہے تو؟''

جب آپا زہرہ کی بے عزتی عروج کو پہنچتی ہے تو شرابی کہیں سے آ ٹپکتا ہے اور کہتا ہے..... ''چل ایک شرابی ایک طوائف، ہم دونوں اس کٹڑی میں رہنے کے قابل نہیں۔''

خاں صاحب نے فیروز پور روڈ کی مین سڑک سے ہٹ کر ایک کٹڑی کرایہ پر لے رکھی تھی اور ا شروع کر دی تھی، لیکن اردو بورڈ کا کنا بھی ساتھ تھا۔ وہ بیچارے بڑی مشکل میں تھے۔ ایک روز میرے اور بولے۔

''کیا کر رہی ہو قدسیہ؟''

''بس جی بچے آئے ہیں۔ کھانا تیار کر رہی ہوں۔''

''فضول جھنجھٹ چھوڑو اور میرے ساتھ چلو۔''

''اور جی بچے؟''

''انہیں بھی ساتھ لو..... شفٹ کا کرایہ پڑ رہا ہے۔ کیمرہ مین بڑے نخرے والا آدمی ہے۔''

میں اور بچے فوکسی میں سوار ہو گئے۔

کٹڑی کا عجب سماں تھا۔ ایک جانب بوسیدہ سے تین چار کمرے، پھر کھلا اُجاڑ آنگن اور سامنے

نور تھا۔

معلوم نہیں تھا کہ مجھ پر خاں صاحب ایک اضافی ذمہ داری ڈالنا چاہ رہے ہیں۔ انہوں نے جس طرح مجھے رکھا۔ اب بھی وہ میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں اس وقت سلیم خواجہ اپنے ...ان سجائے بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر کچھ ڈھارس بندھی۔

...کی طرح خواجہ جی نے اُٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

...قی سب کچھ تمہیں خواجہ جی سمجھا دیں گے۔''

...بیچ دریا کے چھوڑ کر خاں صاحب اردو بورڈ میں جا بیٹھے۔ اس وقت ''شام شہر ہول'' کی شوٹنگ ہونے والی ...یاں پہنا کر قدیر ملک درخت کے تھڑے تک لے گئے۔

...یری قوی سے پہلی ملاقات تھی۔ اس وقت ریہرسل جاری تھی۔ قوی کا چوبارہ شاہدہ کے تنور کے ساتھ ساتھ ...یں پر جاتا تھا۔ قوی کو ان سیڑھیوں سے تھکا ہارا اُترنا تھا۔ گانے کا ٹیپ جاری تھا۔ منیر نیازی کے بول ساری ...ج رہے تھے۔ کیمرہ مین تصویر بنا رہا تھا۔ کچھ تو مجھے یہ اتھارٹی سر کو چڑھ گئی۔ پھر قوی کی سعادت مندی نے ...دی کر دی۔ میں فرعون صفت آرڈر دینے پر مامور ہوگئی۔

...چھی طرح یاد ہے یہ ٹیک پوری بارہ مرتبہ Re-take ہونے کے بعد مکمل ہوئی۔ پندرہ مرتبہ اوپر نیچے کی ...ل نڈھال ہو کر اُترا تو واقعی وہ منیر نیازی کا ہیرو لگ رہا تھا۔

...قوی کے ساتھ مراسم جاری ہیں۔ قوی خاں میں جو پٹھانی لہو ہے، اس میں وہی اظہار کی کمی ہے جو ...یے پن اور منیر کے موسموں کی چپ میں چھپا ہوا تھا۔ قوی نے ناہید سے شادی کی تو بھی اس نے ہمیں ...س شادی کا ذکر اتنے دبے لفظوں میں کیا گویا کسی دوسرے کی بیوی کے ساتھ بھاگ گیا ہو۔ قوی کی شخصیت ...ور دوسرے مردوں پر شاید فرعونیت کا پڑتا ہو لیکن تمام عورتوں کو قوی کی شرم و حیا نے ہمیشہ متاثر کیا۔ نگاہیں ...نے والے قوی سے کبھی کسی ایکٹریس کو گلہ نہ ہوا۔

...یب اپنے اندر ایک خاص قسم کے نظریے کو پالتا ہے۔ اشفاق صاحب نے ایسا ادب پیدا کیا جو پاکستان ...لیکن ایک اور بات پر وہ مُصر نظر آتے تھے۔ وہ جیو اور جینے دو کے پرچارک تھے۔ کہانی ''گڈریا'' سے ...وہ اس سلوگن کا شکار ہے۔ انہوں نے مفتی جی کی طرح ادب میں کئی کروٹیں لیں۔ بس وہ اسی مسلک ...سے لکھتے رہے لیکن ہر انسان میں توازن کی کمی ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنے مسلک میں بھی کبھی توازن قائم نہیں کر ...س قدر محنت میں گم ہو جاتا ہے کہ اسے آرام، خوشی اور خاندان کی پروا نہیں رہتی۔ اسے جو راحت اور خوشی ...زن کے باعث اسی محنت میں ملتی ہے۔ جو آدمی دولت کو بے دریغ استعمال کرنے کا عادی ہو اسے کبھی ...کفایت کا ہاتھ پکڑنے اور ضرورت بھر خرچنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ سوشل آدمی اگر اس درجہ ملنسار ہو جائے ...ت کا مصرف صرف یار باشی میں نظر آنے لگے تو اسے پھر نکما نکھٹو اور دوسروں سے مانگنے والا بن کر گزارہ کرنا

خاں صاحب میں بھی کسی حد تک توازن کی کمی تھی۔ وہ جیو کی حد تک تو اپنے مسلک پر قائم تھے، جیتے
پروا تھے۔ اپنے لیے اور گھر والوں کے لیے ''جینے دو'' کا مطلب انہیں سے سمجھ میں آیا کہ ان کو آزادی دی جا
چاہیں کریں۔ وقت اور مداخلت ان پر ضائع نہ کریں۔ اگر جینے دو اور جیو میں توازن ہوتا تو انہیں بچوں سے
دلجوئی اور مشکلات کا باہمی حل مل جل کر نکالنا پڑتا۔ اپنے لیے بھی انہیں جینے دو کی کبھی سمجھ نہ آئی۔ وہ زیادہ کا
سوتے، اپنی صحت کی طرف سے بے توجہی برتتے رہے۔ زندگی کے کئی خانے ہیں لیکن ان میں پیشہ، خاندان
ان سب میں وقت کی بانٹ اور توازن نہ ہو تو کسی نہ کسی کے ساتھ ناانصافی کا انسان مرتکب ہو ہی جاتا ہے۔

جب ہم 75۔ جی میں تھے تو ٹیلی ویژن کی آمد نے خاں صاحب کو یقین دلا دیا تھا کہ اب نا
کتابوں سے نہیں ٹیلی ویژن سے اخذ کریں گے۔ نئے راستوں کی تلاش ''آنچ'' سوچ کی نئی منزلوں نے انہیں
اکسایا۔

''دھوپ سائے'' ایک آرٹ فلم تھی۔ اس کی بنیادی تھیم یہی تھی۔ ''جیو اور جینے دو''۔ اس کی کہانی
میں رہنے والوں کی کہانی تھی۔ اس محلے میں رکشا ڈرائیور، ایک بیمار بچے کی ماں، ان پڑھ پھیری والا۔ ایک
نیکی اور بدی میں ہاتھ دیے پھرتی تھی۔

خاں صاحب جن دنوں ''دھوپ سائے'' کے سکرپٹ کی ذہنی تیاری میں مبتلا تھے۔ ہوائی جہاز ٹیک
سے پہلے تیل پانی چیک ہو رہا تھا۔ انجن اور پہیوں کی ہوا کو جانچا جا رہا تھا۔ خاں صاحب گومگو کے عالم میں
بڑے کمرے میں کچھ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ جاتے۔ وہ ہر ہر قلم کو ٹیسٹ کرتے اور دیکھنا چاہتے کہ ''دھوپ
سکرپٹ کس پن سے لکھیں گے۔ کونسی سیاہی موزوں ہے۔ کونسا کاغذ محبوبہ کی جلد جیسا ملائم جان پڑتا ہے۔

مختلف شیفر، پارکر، ڈالر، سستے قیمتی قلموں کی ٹرائی جن کاغذوں پر کی گئی میرے پاس ان کاغذوں کا
انبار ہے..... پن منتخب کرنے کے بعد کاغذوں کی باری آتی۔ کھلی لائنوں والے تنگ لائنوں والے۔ فل سکیپ
ہر قسم کی ڈائریاں غرضیکہ اشفاق احمد صاحب جب بھی لکھنے کا عمل جاری کرتے، ان کے لیے تیاری، ہشیاری
کا عمل ساتھ ہی شروع ہو جاتا۔ انہیں سٹارٹ لینے میں دقت پیش آتی۔ اپنے تخلیقی گھوڑے کو سانٹا مار کر ریس
کرنے میں مرحلہ وار تیاری کرنی پڑتی۔ جابجا مختلف کاغذوں پر رنگ رنگ کے پنوں سے بے ربط، باربط چیز
کے بعد ناک کے بالوں کو دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے کھینچتے ہوئے ابروؤں کے لمبے بال جڑ سے اکھاڑتے
کے دوران وہ اپنے ٹاپک، کہانی، مضمون کے متعلق سوچتے چلے جاتے۔

عام طور پر وہ قلم testing کرتے وقت ''اس کے علاوہ'' سے شروع کرتے تھے۔ کبھی کبھی قلم سے
اظہارِ خیال کر دیتے۔ ان کے برعکس مجھے کاغذ، کاپی، پن میسر آ جاتا، وقت ملنے پر میں لکھنے پر آمادہ ہو جاتی۔ مجھے
لوگوں نے لکھتے دیکھا ہوگا کیونکہ میں عموماً خاں صاحب کے دفتر جانے کے بعد بچوں کے سکول، کالج سے واپس
جو کچھ بھی دماغ میں ہوتا، کاغذوں پر اُتار لیتی۔

میرے ایگل کے پن میں سیاہی ہمیشہ شفقو بھرتے۔ میری میز پر کامن پنیں، کلپ، ڈائریاں

میں بھی وہی ڈالتے۔ ابھی تک مجھے پن میں سیاہی بھرنا نہیں آیا۔ نہ قلم کو لکھ کر چیک کرنے کی صلاحیت ہی
تم وہی چیک کرنے کے عادی تھے۔
تم اور کاغذ کی آمادگی دیکھ چکنے کے بعد وہ تخلیقی علم کی انگیخت کے لیے تھوڑا تھوڑا کئی کتابوں سے چر چگ لیتے۔
پر آمادہ ہو جاتا، قلب اپنی بات پیش کرنے پر motivate ہو جاتا۔ ایسے میں مطالعہ رنگا رنگ ہوتا۔ فکشن وہ
تے۔ شاعری کی کتابیں بھی، اقبال، غالب، فیض، فراز، ناصر کاظمی کی زیر مطالعہ رہتیں۔ میرا اُن سے یہاں
اختلاف رہتا۔ مجھے اقبال کی نسبت غالب پڑھنے کا زیادہ شوق تھا۔ خاں صاحب سوچ سے وابستہ انسان
کے گرد دیر تک سوچتے رہتے۔ پچھلے بیس پچیس سال میں اُن کا مطالعہ Comparative Religions کی
ہو گیا تھا۔ وہ رنگ رنگ کی انفرمیشن، مختلف مذاہب کا انداز فکر سمجھتے ہوئے کبھی کبھی لکھنے سے پہلے اُن کے
نے لگتے۔

انیس کی کلاس

جس طرح اشفاق کے شاگرد مفت ٹیوشن حاصل کرنے ماڈل ٹاؤن آتے تھے۔ اسی طرح جب انیس ایم بی اے
ے تو داستان سرائے میں اس کے ہم جماعت، ہم درسوں کی رونق بڑھ گئی۔ انیس کے ساتھ پڑھنے والے
صاحبان سے پڑھ چکے اور اُن کے پلے کچھ نہ پڑتا تو سب سائیکلوں پر، کاروں پر، موٹر سائیکلوں پر سوار
آ جاتے۔ لان کی طرف کھلنے والے بڑے کمرے میں اب اصلی جماعت شروع ہو جاتی۔
یہاں کوئی بلیک بورڈ تھا نہ کوئی نقشہ جات، صرف غسل خانے کے ساتھ والی دیوار تھی جس پر گہرا نارنجی پینٹ
شاہد افضل تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چاک اور ڈسٹر ہوتا۔ وہ کئی کئی گھنٹے ہم جماعتوں کو پڑھاتا رہتا۔ اسی خیال
نے کے کمرے کی کالی میز اُن دنوں برآمدے میں کھلنے والے دروازے کے ساتھ تھی۔ دس بارہ لڑکے اس
بیٹھ جاتے۔
افضل پیدائشی گرو تھا۔ وہ نہ سوال جواب سے گھبراتا نہ مناظرے سے بھاگ جانے کی صورت پیدا کرتا۔ سچ تو
افضل کی محنتوں کا ثمر تھا کہ سارے لڑکے اچھے نمبروں سے ایم بی اے کر گئے۔ کلاس میں کچھ شاگرد قابل ذکر
ہم، تحسین اور انیس خاں۔ طالبات میں عاصمہ، شگفتہ اور نغمہ پیش پیش تھیں۔ شگفتہ کے ذمے کلاس کے لیے
شگفتہ غریب الطبع تھی۔ درمیانی شکل اور ذہانت کے ساتھ اُس نے خدمت کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ جب وہ
پر پانی ختم ہو گیا ہے تو فوراً اندر باورچی خانے میں پہنچ جاتی۔ یہاں اُن دنوں پانی فلٹر کرنے والی مشین لگی
پہنچ کر وہ پانی بھرتی، جیونی بہن سے دو چار باتیں کرتی۔
آج کیا پکایا ہے انیس کے مہمانوں کے لیے جیونی بہن۔''
آج تو ثابت مسر ہیں اور کڑھی۔''
پھر دوسرے دن جواب ہوتا۔ ''آج شگفتہ بی بی توے والا قیمہ اور آلو گوشت۔''

یہ خاں صاحب کے ڈیرے کا ازلی Menu تھا۔ نہ جیونی بہن اس کے علاوہ کچھ پکاتی تھیں نہ کبھی جی آتا۔ ان دنوں ٹیلی ویژن تو گھر پر تھا لیکن اس پر وہ کھانے پکانے کی ترکیبیں نہ دکھائی جاتی تھیں۔ ابھی ہوٹل گھروں میں نہیں گھسے تھے۔

نغمہ اپنے نوٹس بخوشی اُدھار دے دیتی اور عاصمہ کلاس کا حسن تھی۔ جس طرح ڈریس ڈیزائنر خاص ماڈل کی وجہ سے مقبول ہوتے ہیں۔ اسی طرح عاصمہ اپنی اداؤں، طرحداریوں کے باعث مقبول تھی۔

تحسین ان دنوں کلاس کی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کرتا۔ شاہد افضل اپنی موٹر سائیکل کی چابی دیتا۔ پھر جب تک وہ اپنے گھر نہیں جاتا، چابی تحسین کے پاس رہتی۔ شاہد افضل میں حیا کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ کچھ دور ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا لیکن اس کی ڈینگیں مارنا شاہد افضل کے مزاج کا حصہ نہ تھا۔ اس نے جماعت کو اپنے پچھلے Status سے مرعوب نہ کیا۔ خاں صاحب کی طرح پٹھان بچے نے کبھی اپنے نام کے ساتھ ملک۔ وہ ہر جگہ اپنے میرٹ کا سہارا لیتا۔

اب 2007ء ہے۔ شاہد افضل امریکہ میں پی آئی اے کا C.E.O. مقرر ہے لیکن وہاں بھی وہ کے سرپر کھڑا ہے اور اپنی کارکردگی کا دیا کھاتا ہے۔ اس کی پہلی بیوی سعدیہ اس کی جھینپو طبیعت سے عاجز آ گئی

بچگان اور اُن کے دوست

گھر میں آ کر ماحول کی تبدیلی، حالات کی تبدیلی، کام کے اوقات میں نیا پن پیدا ہوگیا۔ فراغت کے لمحے نئی سوچیں لے کر کھل گئیں۔ تعلیم و تربیت کی جہت بھی نئی تبدیلی سے آشکار ہوئی۔

ہی ایک کھڑکی جب کھلی تو میں نے خاندانی نظام کے متعلق کچھ زیادہ ہی توجہ سے سوچنا شروع کر دیا۔ اور مغربی نظام میں کتنی مماثلت اور کتنا بعد ہے؟ کیا مشرقی معاشرے کی تنظیم مکمل طور پر خاندان کی مرہون مغرب کو سیکولر سوچ اور جمہوریت نے تو خاندانی نظام کی افادیت سے منکر نہیں کر دیا؟ کیا ہمارے ملک میں ترقی کی راہ میں مذہب اور خاندانی نظام سب سے بڑی رکاوٹ ہے؟ 75ء تک ایسی سوچ اور ایسے مجھے کبھی زیادہ سوچنے پر مجبور نہ کیا تھا۔ اب بھی میں نے کسی سے مشورہ کر کے اپنی سوچ کو مناظرے کی شکل نہ سوچ میں فار اینڈ Against دونوں طرف سے دلائل مجھے خود دینا ہوتے تھے۔

سوچنے پر مجبور تھی کہ معاشرتی نظام میں شادی سب سے بڑا نظام ہے۔ اس ادارے کی بقا میں مستقبل کا تحفظ میں محفوظ ہے۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ مغربی تعلیم اور کلچر کی قدم قدم پذیرائی سے مشرقی Idealism مر رہا نظام کو بھی دھچکے لگ رہے تھے۔ بنیادی طور پر کوئی نظام یا ادارہ آدرشوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

یہی آدرشوں کی یک جہتی جماعت، نظام اور ادارے کو مضبوطی اور استقامت بخشتی ہے۔ ان ہی آدرشوں کی وجود میں آتی ہے لیکن یہاں پھر ایک خطرہ موجود رہتا ہے۔ اس قدر جڑے رہنے کے باعث مرد اور عموماً آزادی بھی مجروح ہونے لگتی ہے۔ مغربی معاشرے نے فرد کی آزادی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت وہاں ہر شخص کو یہ زعم ہوگیا ہے کہ وہ قانون کی پابندی کے بعد فرد کی سطح پر مکمل طور پر آزاد ہے۔ وہ کسی کی دخل دینے کو تیار نہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ اکیلا کافی ہے۔ شخصی آزادی کی آرزو میں مبتلا مرد اور عورت اپنے فیصلے کو لیے جنس اور محبت کی جب تک ذاتی طلب رہے شادی برقرار رہتی ہے۔ جب اندر کے جذبے ٹھنڈے پڑ جوان دنوں ضرورتوں کی کفالت کرتی ہے اسے برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شخصی آزادی میں حقوق

اور فرائض کی مانگ برابر ہوتی ہے لیکن خاندانی نظام میں بات انسانی حقوق (Human Rights) کی نہیں
اپنے حقوق چھوڑ کر بنتا ہے۔

کبھی کبھی بچوں کی معصومیت اور بے بسی کے حوالے سے ماں باپ کو مکمل طور پر اپنی آزادی خوشی
کو تج کر مستقبل کی سنہری کنجی ملتی ہے۔ اتنا ایثار قربانی اور انتظار آج کی عورت کے بس کا نہیں۔ راستہ کہیں
جس کا علم ہر فرد کی سمجھ اور صلاحیتوں پر ہے۔

بھلا کوئی شخص شادی کیوں کرتا ہے؟

آپ شادی سے کیا توقع رکھتے ہیں؟

کچھ لوگ ابھی سوچنے کے قابل بھی نہیں ہوتے جب ان کی شادی ماں باپ کی مرضی سے کر دی
لوگ بڑی تابعداری سے ماں باپ کی خاطر مذہب کی انگلی پکڑ کر شادی کو کامیاب بنانے میں مگن رہتے
نزدیک بچوں کو سر سے چڑھانے کا عمل ہی شادی ہے۔ پرانے زمانے میں ایسی شادی ڈولی سے لحد تک ایسے
سہارے نبھ جاتی تھی۔

مغرب میں بھی پہلے یہی مسلک تھا۔ رابرٹ براؤننگ کے اشعار دیکھیے۔

Grow old along with me
The best is yet to be
The last of life for which
The first was made
Our lives are in his hand

لیکن وقت بدل چکا ہے۔

Elizabeth Barret Browning کے ساتھ تو رابرٹ کی نبھ گئی..... لیکن اب مغرب اس
چکا ہے۔

شاید آج کا مرد اس لیے شادی کرتا ہے کہ وہ عورت کی کفالت کر کے اس پر اپنی برتری ثابت کر
کفالت کرنا جیبوں کی حد تک محدود نہیں اور پہلے زمانے میں مرد اس ذمہ داری کو محسوس تک نہ کرتے تھے
فاتح قسم کے مردوں کا رویہ کرخت ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف آج کی عورت شادی کے بعد مرد کی خدمت
بجائے اسے تبدیل کرنے کی موشگافیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں مفاہمت کے بجائے مسابقت
احتمال رہتا ہے۔ انسان محبت بھی کرے اور سیانا بھی ہو، ناممکن ہے۔ ایسی عورت سے محبت کرنا جو آپ کو
کانٹوں سے شہد چاٹنا ہے لیکن یہ خوف کی رنگ برنگی شکلیں ہیں۔

آج کا ماڈرن مرد اور عورت بھی بچوں پر بہت زور لگاتے ہیں لیکن اس کی وجہ خوف ہے خوف
باپ بچے کو خدائی مہمان نہیں اپنی ذات کی پروجیکشن سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا سارا زور بچے کی تعلیم

ت کو ثانوی حیثیت مل گئی ہے۔ یہ عہد دولت' دولت کے حصول اور دولت کے بل بوتے پر اپنی حیثیت
جو کچھ اس خواہش کی آگ میں جھونکا جا سکے اس سے آج کا ماڈرن انسان دریغ نہیں کرتا۔
ی کا خوف جب معاشرے کا وائرس بن کر پھیلتا ہے تو پھر ایک دوسرے کے حالات سے سرد مہری بن کر
فرد کی سطح پر اور معاشرے کے مجموعی مزاج کے اعتبار سے رزقِ حرام کی یا پھر خودکشی یا خودکش حملے کی شکل
اختیار کر لیتا ہے۔

ج کل کے نوجوان کسی خاص آدرش کے تحت شادی نہیں کرتے۔ عموماً وہ اپنی تنہائی سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔
جھ کر اپنا عکس ساتھی کے وجود میں دیکھنے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ کچھ فقط مسابقت سے خوفزدہ فقط اپنا
نے کا سوچ کر شادی کر بیٹھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر انسان کوئلے کی طرح ہے۔ یہ گرافائٹ
بھی ہے اور ہیرا بھی..... دباؤ سہہ جائے تو ہیرا ہے ورنہ معمولی کوئلہ..... اسے بدی سے نیکی اور متعفن بدی کا
جیسی تھی۔ اسی لیے ہر انسان اپنی سوچ' عمل' رویے کے مطابق شادی کو فرحت بخش ٹھنڈا پانی یا کھولتا ہوا
تا ہے۔

دی کی شراکت داری میں شامل ہو کر شخصی آزادی کا خواہاں نوجوان Privacy کی تلاش میں مارا مارا پھرتا
جذبات' خیالات' حالات' اشیاء کی Sharing ختم ہوتی ہے' تو خاندان کا ثقل بگڑتا ہے۔ جہاں کہیں خاندان
بنے کے مقام پر فائز ہو کر لینے کا تقاضا شروع کر دیتے ہیں۔ جہاں ادارے یا نظام یا جماعت کو مضبوط کرنے کی
بھی افراد چالاکی' خود فریبی اور انا کے چکر میں خدمت کرتے ہیں۔ وہاں آہستہ آہستہ ذاتی طاقت کا سفر شروع
پھر مرد ہو یا عورت وہ پرورش کا فن بھول جاتا ہے اور اپنی پرورش میں لگ جاتا ہے۔ یہیں سے معاشرے
ت میں آمریت کا بیج بویا جاتا ہے۔
م انسان صرف اپنے حواسِ خمسہ کی روشنی میں اپنی جسمانی زندگی کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر سوچتا اور زندگی
سے اپنی روحانی تلاش کا ادراک تک نہیں ہوتا۔ وہ خدا' ماورا' مذہب سے وابستگی اور اس سے پیدا ہونے والی
بے خبر ہوا کرتا ہے' اسی لیے اسے نہ شادی کی سمت' نہ اس کی ذمہ داری ہی کا کوئی احساس ہوتا ہے لیکن یہ مت
ہیں اپنی ضروریات سے ہٹ کر بے لوث خدمت کا تصور پیدا ہوتا ہے' خطرہ وہاں بھی موجود رہتا ہے' کیونکہ
خدمت کا اجر بھی مانگتے ہیں۔ یہاں پھر جماعت کی خدمت بے معنی ہو جاتی ہے۔ انسان جب اندر کی اندر
ت سے سبکدوش ہوتا ہے تو وہ اپنے متعلق سوچتا ہے۔ وہاں پھر Power کا تصور پیدا ہو جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ
چکر میں پھنس جاتا ہے۔
ن دونوں صورتوں سے بچنے کے لیے اگر انسان کو صرف اپنا کردار' اخلاق اور اندرونی بالیدگی کے سفر کا خیال
ے ...للہ کو قرضِ حسنہ دینے کے چکر میں ہو تو شاید اس کے مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ کسی کو مرعوب کرنے'
ے اس کو ٹھیک کرنے کا جنون ہو تو شادی اور زندگی دونوں کا سفر رائیگاں جاتا ہے۔
گر اپنے آپ کو درست کرنے کے ارادے سے انسان کو ایسے تخلیے کی ضرورت ہو جس میں بیٹھ کر وہ عرفانِ

ذات اور اس سوچ بچار کے نتیجے میں اپنی غلطیاں ٹھیک کرنے کے لیے وقت درکار ہو تو اس عزلت نشینی کے لیے
ذیل میں درج ہیں:

1- ملنے والے بار بار گھر آنے والے افسران سے اپنے لیے نوکری میں Extension‘ بیٹے کے لیے
بیٹی کی ترقی کے لیے اصرار شروع کر دیں..... بھیڑ چھٹ جائے گی۔

2- امیر رشتہ داروں سے قرض کی درخواست کریں۔

3- طبقہ اناث کی نوجوان عورتوں‘ لڑکیوں سے پردے کی خوبیاں‘ شوہر کی اطاعت اور ہر طرف سے بچ
بیان کریں۔

4- بوڑھی عورتوں کو اپنی اور گھر والوں کی خدمت پر اکسائیں۔ وہ بھاگ جائیں گی۔

5- ملازمین کو ڈسپلن سکھائیں۔ ملازم حضرات اپنی مصیبتوں کو لے کر آپ کے گرد جمع نہیں ہوں گے۔

6- مہمان سے تقاضا کریں کہ وہ گھر آنے سے پہلے اطلاع ضرور دے اور کتنی دیر ٹھہرے گا اس کا تعین پہ
کر دے۔

اس ہدایت نامے پر عمل کرنے سے آپ کو وہ تنہائی نصیب ہوگی جو عرفانِ ذات کے لیے وقف کی
لیکن کچھ لوگ اس ہدایت نامے پر عمل کر کے تنہائی کے اوقات کسی اور منفی عمل کے لیے بھی استعمال میں لا سکتے ہیں۔

انسان کو سمجھنا ویسے ہی بہت مشکل ہے کیونکہ کسی کی نیت کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے علم غیب
رہنمائی کر سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو انسان اپنی نیت کو بھی واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا۔ اس نیت کی بدولت بڑے کھلے
خاص کر وہ لوگ جو لمبے سفر میں ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کا عزم کرتے ہیں‘ کبھی شوہر ہیرے کا ہار بھی بر
لے آتا ہے اور کبھی آپ ہی کا دوپٹہ اچھی نیت سے آپ کے حوالے کر دیتا ہے۔ کبھی راتوں کو جاگ کر اندر لعن
والی ماں بھی اپنے عمل کو کھوٹا کر دیتی ہے اور بعض اوقات اچھی نیت سے جاں نثار سید کرنے والی کسی کی عاقبت
موجب بن جاتی ہے۔

اسی سلسلہ میں یقیناً آپ نے مجھ سے زیادہ سوچا ہوگا لیکن میں ایک نتیجے پر پہنچی ہوں کہ انسا
سائیکل کے ہب کی مانند ہے۔ ساری خوبیوں‘ خرابیوں کی سپوکیں اسی ہب یا دھرے سے جڑی ہیں۔
سپوک ہب سے اکھڑ جاتی ہے‘ اسی لمحے سائیکل کی رفتار متاثر ہو جاتی ہے۔ نیت کی خرابی کے باعث جونہی
کسی خوبی پر نازاں ہونے لگتا ہے‘ وہ گھاٹے کی طرف بڑھنے لگتا ہے اور کسی کو نقصان پہنچے نہ پہنچے‘ اس کی اپنی ذ
سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

میں چوری چوری خاں صاحب کے اعمال اور اقوال کا جائزہ لیا کرتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کبھی ا
دست سوال دراز نہیں کرتے تھے۔ یہاں ان کی ازلی غیرت ان کی نیت کو قبلہ رو رکھتی۔ انہیں بارہا دیکھا‘ بڑی بڑ
آئیں لیکن انہوں نے کبھی اپنے کسی بھانجے‘ بھتیجے‘ بھائی یا اپنے بیٹے تک کو ٹیلی فون ملا کر یہ نہیں کہا کہ مجھ پر یہ
ہے۔ میری اعانت کو آؤ۔

تھے۔ اس کے ساتھ ہی اگر کسی اور کی چھوٹی سی تکلیف بھی پتہ چلی' فوراً کاسہ گدائی اٹھایا۔ دفتروں کے باہر بیٹھے [illegible] کر لوٹے۔ لوگوں کا بھرم رکھنے کے لیے' ان کی عزتِ نفس کا تحفظ کرنے کے لیے انہوں نے سفارشیں [illegible] سے مانگا' اپنا خرچ کم کیا لیکن میری اتنی ذلت ہوئی' کبھی کسی پر احسان نہ دھرا' کسی انسان کی کمر میں مکا مار کر [illegible] نہیں کہا: ''تیری وجہ سے نیت تو دور کی بات ہے، وہ تو پشتی اور موروثی غیرت مند تھے۔ ایک ہب سے ان کی [illegible] خوبیاں اور خرابیاں جڑی تھیں۔''

لیکن کیا کیا جائے انسان تو ہمیشہ تضاد کا شکار رہتا ہے۔ یہی ایک خوبی جو ان گنت خوبیوں کا باعث ہوتی ہے' یہی خرابی کی وجہ بھی ہوتی ہے۔

خان صاحب بھی اپنے نسلی گروپ کی بنیادی خوبی 'غیرت' سے آراستہ تھے۔ یوں وہ اپنی Genetics سے [illegible] نہ ہو سکے۔ شاید اسی بنیادی وصف کا ذکر قرآن میں ملتا ہے کہ تم قبیلوں میں بٹ جاؤ تاکہ یہ قبیلے تمہاری [illegible] ہوں۔ ایک اور مثال سے بات آگے بڑھائی جا سکتی ہے۔ سفید فام قوموں کی بنیادی خوبی خلقِ خدا کی [illegible] وہ خدمت کے جذبے کے تحت محبت کا جھنڈا اٹھا کر بڑے جوش و خروش سے رفاہی کام کرتے ہیں۔ اس موقع [illegible] انہیں پہلے بمباری کر کے کسی معاشرے کو تباہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ وہ بڑے جوش سے کسی بستی کو تباہ کر کے پھر اس [illegible] کیمپ' سکول' ہسپتال کھولیں گے اور بے دریغ مدد کریں گے۔ اسی خدمت کا تجزیہ کریں تو واضح ہوتا ہے کہ [illegible] نعم البدل نہیں اور محنت کسی بھی طور خدمت کے درجے کو نہیں پہنچتی۔

خان صاحب بھی پٹھانوں کی طرح غیرت مند تھے۔ اسی خوبی نے انہیں بہادر بنایا۔ آدرشوں کی مشکل زندگی کو [illegible] یا لیکن اسی خوبی نے ان کے اندر گہری چپ کو جنم دیا۔ وہ اپنے غم اپنی خوشی کو اندر ہی اندر چیونگم کی طرح [illegible] لیکن کسی دوسرے پر اندر کے موسم کا حال نہ کہتے۔ ممتاز مفتی خان صاحب کو گونگا کہتے تھے۔ مسلسل کرید کے [illegible] دوست ہار جاتے لیکن ان کے لب تک کوئی حرفِ شکایت نہ آتا۔

میں نے خان صاحب کی اس خرابی کے ساتھ رہنا سیکھ لیا تھا۔ میں جانتی تھی اس رازداری کے باعث ہم نفسی ان [illegible] نہیں۔ وہ غیرت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ غیرت مند طبعاً اداس آدمی ہوا کرتا ہے۔ دوسروں کو آسانیاں بخشنے والا [illegible] چپ چپ اداس آدمی تھا۔

مجھے اسی غیرت نے بہت نفع پہنچایا۔ اسی خوبی نے خان صاحب کو میری پوری کفالت کرنے پر آمادہ کیا۔ انہوں نے تو مجھے کبھی بجری سیمنٹ لانے کو نہیں کہا۔ آپ کو یقین تو نہیں آئے گا لیکن 121۔سی میں جب ہم آئے تو مجھے [illegible] طرح وہ ڈیوڑھا کام کرتے تھے۔ وہ گھر تعمیر ہوا' کیسے ہوا' کیسے اس کا نقشہ پاس کرایا گیا؟ ٹھیکیدار خادم کہاں [illegible] روڑی چپس بجری کیسے آئی؟ سریا' شیشہ' کنڈے چھکے کون خریدنے گیا؟ میں تو آرام سے بچوں سمیت اس وقت آئی جب گھر پینٹ پالش سے چمکتا دلہن کی طرح جگمگاتا کھڑا تھا۔

[illegible] جس روز اس گھر کی بنیادیں کھودنے کا دن تھا' ایک روز صبح سویرے خان صاحب اپنی فوکسی میں آئے۔ [illegible] وہ ایسی شاذ ہی کرتے تھے۔ میں کھانے کے کمرے میں آنند سے بیٹھی لکھ رہی تھی۔

”قدسیہ.....!“

”جی آپ کہاں؟“

”جلدی چلو اماں جی کار میں بیٹھی ہیں۔“

”تو انہیں اندر لے آئیے ناں۔“

میں نے سوال نہ کیا کہ اماں جی کار میں کیوں بیٹھی ہیں۔ کار تک پہنچنے میں انہوں نے صرف ایک

کیا: ”بچے کہاں ہیں؟“

”سکول جی۔“

”اچھا۔“

اماں جی سردار بیگم فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہی گورا چٹا خوبصورت خوش مزاج وجود۔ بڑی خوش

میرے سلام کا جواب دیا..... فوکسی روانہ ہوگئی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟

جہاں اب 121۔سی ہے اس گھر کے بائیں ہاتھ سکھوں کے زمانے کی ایک پرانی کوٹھی تھی۔ باقی

حد تک اجاڑ تھا۔ کار عین اسی جگہ آ کر رکی جہاں اب داستان سرائے کا بورڈ نصب ہے۔ ہوائی رنگ کی فوکسی

صاحب اترے۔ میں بھی ان کی دیکھا دیکھی اتر گئی۔ اماں جی کسی سہارے لاٹھی کے بغیر آرام سے اتر کر خاں صاحب

ساتھ ہو گئیں۔

فضا میں تازہ مٹی اور اماں جی کے عطر کی خوشبو تھی۔ شاید آپ کو خیال آئے کہ اتنے برس گزر جانے

میرے اصلی جذبات میرے ذہن میں دھندلا گئے ہیں لیکن سچ بات یہ ہے کہ مجھے اس وقت بھی خاں صاحب

کے تعلق پر حسد نہیں آیا۔ میں اس وقت بھی اپنے آپ کو غاصب سمجھتی تھی۔ آج بھی میرا خیال ہے جو نوجوان

کے حقوق کو اپنے حقوق پر فائز نہیں سمجھتی وہ بڑی غلطی پر ہے۔

مجھے علم نہ تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ اجاڑ سی جگہ پر سڑک پار ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ یہ ٹیوب ویل کا

تھا جو ماڈل ٹاؤن میں پانی کی ترسیل کا کام تھا۔ برساتوں میں پانی نالے سے نکل کر آہستہ آہستہ دور تک رستے

زمین کے دائیں طرف سر ظفر اللہ خاں کا پرانا سکھوں کے عہد کا بنا ہوا گھر تھا۔

بائیں جانب بھی سکھوں کے عہد کی ایک پرانی کوٹھی تھی۔ سر ظفر اللہ کی کوٹھی ہمارے آنے تک ان کی

ملکیت بن گئی..... لیکن وہ لندن میں رہتی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ پاکستان آتی اور ربوہ جاتی تو ان کی طرف سے محبت

چارے کا بھرپور مظاہرہ ہوتا۔ ایک بار وہ مجھے ربوہ بھی لے گئی جہاں میں نے کالج کے ایک بڑے فنکشن میں شمولیت

ہماری زمین پر دو تین مزدور صورت آدمی کھڑے تھے۔ پھر ایک جھگی سے محمد علی ہمارا پرانا خدمت

ٹھیکیدار خادم برآمد ہوئے۔ ہم وہاں پہنچے جہاں بچوں کا بیڈروم بنا۔ خادم نے آتے ہی خاں صاحب اور اماں جی

اور اماں جی سے دعا کی استدعا کی۔ اماں جی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ہم سب نے تقلید کی۔

پھر اماں جی کے ہاتھ میں گینتی پکڑا کر کہا: ”اماں جی! یہاں ٹک لگا دیجیے۔ کھدائی ہم خود کر لیں گے۔“

تندرست تھیں۔ ایک ہی ہلے میں کافی گہرا ٹنک لگا دیا۔ لیجیے داستان سرائے کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اس کے بعد یہ گھر کیونکر بنا۔ اس میں کیا کیا بکھیڑے تھے۔ کیا کیا اڑچنیں تھیں' مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ میں صرف یہ جانتی تھی کہ حساب کتاب رکھتا تھا اور عبدالرزاق رات کو دفتر کے بعد جھگی میں سامان کی نگرانی کے لیے ہوتا تھا۔ جس روز خاں صاحب مجھے لے کر یہاں پہنچے۔

میرے سامنے جیسے کھل جا سم سم بن کر ایک بنا بنایا پختہ گھر یلک جھپکے وارد ہو گیا۔ خادم ٹھیکیدار برآمدے میں کھڑا تھا۔ مرمر کے فرش فیشن میں ہیں۔ بچھو دی آئی پی فرشوں کو تیک کی لکڑی سے تعمیر کر رہے ہیں لیکن 1970ء میں یہ فرش اچھا تھا۔ جوں جوں وقت بدلتا ہے ایجادات نئی چکا چوند لے کر در آتی ہیں۔ فیشن بھی تبدیلی کے آشنا ہو جاتے ہیں۔ اب سنگ مرمر اور لکڑی سے آہنی فرش چکائے جاتے ہیں۔ آگے جانے کیا ہو گا۔

خادم کے ہاتھ میں گھر کے تین دروازے کی چابیاں تھیں۔ ہم دونوں کے آنے پر اس نے بڑے فخریہ انداز میں پیش کیں وہ چابیاں مجھے دے دیں۔ خاں صاحب کو چابی دینا چاہی۔

"مجھے کیوں چابی دے رہے ہو۔ بھائی مالکن کو دو..... یہ جانے اور اس کی چابیاں....."

میں کچھ محجوب' کچھ دنگ' کچھ پریشان لمبے برآمدے میں چلنے لگی۔ ساتھ ساتھ خادم نے پہلے گیسٹ روم پھر بچوں کے کمروں کے تالے کھولے..... اوپر جانے والی سیڑھیاں دکھائیں۔

"بی بی جی اوپر ابھی صرف خاں صاحب کی لائبریری ہی بنی ہے۔"

"بہت ہے خادم بہت ہے۔ ہماری ضرورت کے لیے بہت ہے۔"

"پہ نہیں جی کیا بات ہے آج محمد علی اور عبدالرزاق نہیں آئے۔"

یوں لگتا ہے کہ محمد علی وفاداری کا سمبل بن کر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہا۔ اس نے سارے گھر کا حساب کتاب لکھا اور اس کی لکھی ہوئی یہ کاپی ابھی تک موجود ہے جس میں پائی پائی کا حساب ہے۔ عبدالرزاق رات کو گھر میں سویا کرتا اور خوب نگرانی کرتا تھا۔

"مرید کام کر رہا ہے خاں صاحب اس سے مل کر جائیے گا۔"

"اچھا....." لیکن انہوں نے میرے ساتھ گیراج کا چکر نہیں لگایا۔ مرید گیراج میں لکڑی کا کام کیا کرتا تھا۔ کوٹھی بننے کے بعد اس نے گھر کے لیے پلنگ' تپائیاں' شیلف' کتابوں کی الماریاں بھی تیار کیں۔ ہم اپنے ساتھ وہ تخت پوش' کھانے کی میز کرسیاں لائے جو کچھ سامان تو شیخوپورہ میں مہاجرین کا سامان نیلام ہونے کے وقت خریدا گیا اور کچھ اِدھر اُدھر سے اکٹھا ہو گیا تھا۔

جس طرح بنا بنایا گھر مجھے ملا' اسی طرح سامان ڈھونے' اس کو فرنیچر سے سجانے' اس میں پرانے پردے ٹانگنے' دیا جلانے کا سب انتظام موجود تھا۔ میں نے ان امور خانہ داری میں نہ کوئی دلچسپی لی' نہ یہ سمجھا کہ مجھے کس قسم کے ضرورت ہے۔

اس گھر کے پہلے تین خاں صاحب' انیق' انیس اور اثیر اور بانو قدسیہ مقرر ہوئے۔ 75۔جی کا گھر بڑی لاتعلقی

ے چھوڑ کر ہم لوگ ایک نئے دور میں داخل ہو گئے۔ ابھی بچگان ڈویژن ماڈل سکول میں رمضان بھائی کے [illegible] تھے لیکن یہاں سے سکول کا فاصلہ کافی تھا۔ فوراً ہی سائیکلوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔

تینوں بچے ماسٹر بیڈروم کے ساتھ والے کمرے میں Discussion کرتے۔

"بھئی لینا ہے تو ریلے کا سائیکل ہی لینا ہے۔"

"ابو کی ہو پر ل گئی ہے۔ اب وہ نیا سائیکل لے کر نہیں دیں گے۔"

"ہم تینوں کیسے ایک ہو پر جا سکتے ہیں سکول؟"

انیق بہادر بن کر کہتا..... "تم اثیر ڈنڈے پر لالہ کیریئر پر اور میں سائیکل چلاؤں گا۔"

"اور بستے؟"

"وہ بھی ہوں گے تمہاری گود میں۔"

یہ مباحثے ضرور ہوتے لیکن جونہی میں کمرے میں پہنچتی وہ تینوں چپ ہو جاتے۔ یہ بات یہاں اس [illegible] ذکر ہے کہ میں آپ کو کچھ بچوں کی جبیعت کے متعلق اور کچھ اپنی اور خاں صاحب کی تربیت کے متعلق عرض کر سکوں [illegible] اسے میرے بچوں کی جبلتی کمزوری یا پیدائشی گونگا پن کہہ سکتے ہیں۔ وہ اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کا کبھی برملا [illegible] کرتے۔

شاید اسی لیے ان میں مسابقت کا جذبہ کم ہے۔ ہو سکتا ہے اسی گونگے پن نے ان میں خود اعتمادی پیدا [illegible] ہونے دی کیونکہ منوانے والا عموماً لیڈر صفات کا حامل ہوا کرتا ہے۔ وہ مکا دکھا کر میز بجا کر انگلی اٹھا کر دوسروں کی بولتی [illegible] دیتا ہے۔ آج کے عہد کے بچے ماننے والے عہد سے نکل کر منوانے والے عہد کے نمائندہ ہیں۔ وہ ماں باپ [illegible] استاد کو بے وقعت اور اپنے سے عمر میں بڑے کی بے عزتی کرنے کو گناہ نہیں سمجھتے۔

121۔ سی میں آئے تو ہمارے بچے بکریاں تھے۔ شاید انہیں مجھ سے محبت زیادہ تھی یا خوف کا عنصر [illegible] انہوں نے کبھی دوبدو بحث کر کے اپنی منوانے کی کوشش نہیں کی۔ اپنی خواہشات کے بیان میں بھی غالباً یہی وجہ [illegible] تھے۔ انہوں نے کبھی دھونس کے ساتھ کچھ نہیں مانگا۔ انیق احمد صاحب جب سکول میں فٹ بال ٹیم کے کھلاڑی بنے [illegible] فٹ بال کے جوتوں کی اشد ضرورت تھی۔ استاد کی جھڑکیوں سے عاجز آ کر بڑی لجاجت سے ایک روز انہوں [illegible] کہا..... "امی وہ فٹ بال کے ٹیچر ناراض ہوتے ہیں....."

"کیوں؟"

"جب فٹ بال کی ہٹ ٹھیک نہیں لگتی۔"

"کہاں کھیلتے ہو فٹ بال۔"

"بی جی..... جو سکول کے سامنے گراؤنڈ ہے اس میں۔"

پہلے تو میرا جی چاہا کہ میں اسے فٹ بال کھیلنے سے منع کر دوں پر وہ میرے منع کرنے سے پہلے بولا..... "امی جی انہوں نے مجھے تھپڑ بھی مارا۔ کہتے ہیں اگر بوٹ نہ لائے تو اور ماروں گا۔"

...سے مار پیٹ کے خلاف ہوں۔ اس میں کچھ دخل میری خوفزدہ ذہنیت کا بھی ہے۔ خوف زدگی کئی اور ... پیدا کرتی ہے۔ خوف بزدلی اور جھوٹ کو جنم دیتا ہے۔ سراسیمگی اور اداسی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ میں نے ... میں ڈاکٹر مشتاق سے ملوں گی اور ان ٹیچر صاحبان کے خلاف مقدمہ دائر کروں گی جو میرے بچوں کو مارنے ... ہیں۔

... کون مارتا ہے تمہیں؟''

... تو سبھی ہیں لیکن سب سے زیادہ اردو کے ٹیچر ہاتھ اٹھاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں یہ اردو کے اتنے ... ہے؟ خاک باپ کا نام روشن کرو گے؟''

... بال کے بوٹوں کے لیے میں نے بیس روپے مارے باندھے انیق کو دے دیے۔ اس وقت یہ بہت بڑی

... دن میں ٹیکسی میں بھری سکول پہنچی۔ ڈاکٹر مشتاق ایک بڑے ہی سلجھے ہوئے محبت سے ڈسپلن کرنے ... تھے۔ ان کا کیریئر دہلی کے ایک ماڈل سکول کو سنبھالنے میں خرچ ہوا۔

... نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا..... ''اگر میرے بچوں کو کسی نے ہاتھ لگایا تو میں اسی دن انہیں سکول سے اٹھا لوں ... گی ... میں..... مجھے ایسی تعلیم نہیں چاہیے.....''

... بچوں نے واقعتاً تعلیم کی طرف توجہ نہ دی۔ مجھے اس کی تین وجوہات نظر آتی ہیں۔ خان صاحب مکمل ... کرتے تھے۔ اس احتیاط کی غالباً وجہ ان کی اردو بورڈ میں مصروفیات اور پھر ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن ... اور کام بھی ایسا تھا کہ انہیں بچوں کی طرف سے غفلت برتنا پڑی۔ وہ اپنے بچوں کو سوئمنگ سکھانے لی... پول پر ضرور لے جاتے۔ اگر وہ کسی گاؤں میں رہتے تو یقیناً وہ اپنے بچوں کو گھڑ سواری بھی سکھاتے لیکن ... حاصل کر رہے ہیں اس کی طرف ان کی توجہ نہ تھی۔

... بچوں اپنے اپنے کو ڈھنگ میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ انیق جب گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا تو ... سے پیسے نہ دے سکتی جو اکثر ہوتا' وہ واپسی پر گورنمنٹ کالج سے پیدل گھر آ جاتا..... یہ ایک بہت لمبا فاصلہ ... نے کبھی شکایت نہیں کی..... انیس کا ریکارڈ ہے کہ اس نے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ کالج میں جانے کے بعد ... بازار لے بھی جاتی تو بھی وہ خالی ہاتھ ہی لوٹ آتا۔ آج تک اس کی یہی عادت ہے۔ وہ دوسروں کی ... چھپ کر انہیں پوری کرنے میں سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے لیکن اپنی خواہش کا کسی کو علم نہیں ہونے دیتا۔

... خاں ان دونوں سے قدرے مختلف ہے۔ وہ قدرے اپنی منوانے والا بچہ ہے۔ بچپن میں اسے جگر کا ... گیا تھا۔ اس بیماری کا چکر لمبا تھا اور اسی کی وجہ سے ہم اسے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

... قسمتی سے استادوں نے ان سے رویہ سخت رکھا۔ ان میں وہ شفقت اور شاگرد نوازی نہ تھی جس کی بدولت ماسٹر ... صاحب کی زندگی میں گڈریا بن گئے۔ پھر جب خاں صاحب دھرم پورہ میں بابا فضل شاہ کے ڈیرے پر ... ایک اور سمت کے مسافر بن گئے۔ اب ان کا فلسفہ حیات بدل گیا۔ ہمارے گھر میں برآمدے ہی میں دو بورڈ

نصب تھے۔ ان پر باباجی نور والوں کے اقوال زریں لگائے جاتے تھے۔ ان میں جا بجا تعلیم کے منافی اقوال تھے
صاحب گفتگو میں بھی عام طور پر یہ کہتے نظر آتے کہ:

''ان پڑھ انسان نے پاکستان کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا کہ پڑھے لکھوں نے پہنچایا ہے۔''

انہوں نے اس بات کا غالباً اندازہ نہ لگایا کہ مغرب اپنی تمام قوت Strategy اور علم کے ساتھ بہت دوررس نتائج کی سکیموں کے ہمراہ اسلامی ریاستوں کو روحانیت' دین داری' بھائی چارہ اور اخوت کی قدروں سے دنیاوی اور مادی ترقی کا عادی بنا رہا تھا۔ ہم دونوں نے بچوں کی مسابقت پر اعتبار نہ کیا۔ بچوں میں وہ خود اعتمادی نہ ہو سکی' جو مسابقت کی فضا میں جنم لینے والوں کی عادت بن جاتی ہے۔

سب سے بڑا نقص جو میرے بچوں کی تعلیم کا ہوا وہ میرا رویہ تھا۔ مجھے کام کو جانے بغیر اس سمندر میں کودنے کی عادت ہے۔ میں پڑھانے کا فن نہیں جانتی تھی لیکن مصر تھی کہ انہیں میں ہی پڑھاؤں گی۔ مجھے سائنس نامی کسی چیز کا علم نہیں تھا لیکن میں بضد تھی کہ فزکس کیمسٹری بھی میں ہی پڑھاؤں گی۔ میرے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ میں کتاب پڑھتی جاتی اور انہیں سناتی تھی۔

جتنی سمجھ مجھے آ جاتی وہ تعلیم ناکافی تھی۔ میرے ساتھ انیق بیٹھتے۔ وہ غالباً اس لیے کتاب پر توجہ دیتے کہ سعادت مند طبیعت میں میری محبت موجزن تھی۔ اس کے بعد انیس بیٹھا کرتا۔ وہ عموماً کتاب سے کچھ نقل کرنے میں مشغول رہتا۔ اثیر خاں بہت چھوٹا تھا۔ وہ یا تو چھٹی کر لیتا یا قاعدہ کاپی دیکھ کر وقت ٹالتا رہتا۔

انیق خاں کو بھی تعلیم کا شوق کم کم تھا لیکن اس نے بھی کہیں اندر آفتاب بھائی کا مقولہ ٹانگ رکھا تھا۔ بھائی ''اپنے والد کی خاطر'' وکیل بن گئے۔ انیق بھی اپنی ماں کی خاطر پی ایچ۔ڈی کر گئے اور ایم۔ایس۔سی (سائیکالوجی) میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔

جس روز انیق بیٹے کو گولڈ میڈل ملا۔ وہ پھولوں کے ہاروں سے لدا گھر آیا تو اس کا خیال تھا سارے افراد میری والدہ نانا کی طرح خوشی سے چیخیں ماریں گے۔ تالیاں گونجیں گی اور اسے اپنی محنت کا صلہ مل جائے گا۔

گولڈ میڈل ہاتھ میں لیے ہاروں سے لدا پھندا وہ ہمارے بیڈ روم میں آیا۔ خان صاحب حسب معمول مخصوص ٹیبل کے آگے کرسی کھینچے کتابوں کی ورق گردانی میں مشغول تھے۔

''ایکسکیوزمی ابو......'' انیق بولے۔

ابو نے نظریں کتاب سے اٹھائے بغیر آہستہ سے ''ہوں'' کہا۔

''ابو مجھے گولڈ میڈل ملا ہے۔ میں ایم ایس سی میں فرسٹ آیا ہوں۔''

اب بھی انہوں نے انیق پر نظر نہ کی اور اپنے خیالوں میں مشغول لاتعلقی سے بولے ''اچھی بات ہے ہوا''

میں نے اشارے سے انیق صاحب کو بلایا: ''میرے پیچھے آؤ اور یہ ہار گلے سے نہ اتارو..... ہم تمہارے

رہے ہیں۔" سڑک پر پہنچ کر میں نے ایک رکشہ رکوایا۔ اس میں ہم دونوں سوار ہوئے اور ڈویژنل پبلک سکول پہنچے۔ پرنسپل صاحب کے دفتر کا دروازہ کھلا تھا۔ ہم دونوں اندر گئے تو وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

"یہ آپ کا ہونہار انیق ہے سر۔ اسے ایم ایس سی میں گولڈ میڈل ملا ہے۔ میں سمجھتی ہوں آپ سے زیادہ کسی کو خوشی نہیں ہوسکتی۔" انہوں نے انیق کی طرف بڑھتے ہوئے دعاؤں کی ایک قطار لگا دی۔

"آپ دیکھیں گی یہ ملک و قوم کا نام روشن کرے گا۔ اسے نوبل پرائز ملے گا۔ سکول کا نام تو روشن ہوگا ہی۔"

انیق نے اپنے ہار ان کے گلے میں ڈال دیے۔ وہ ہاروں سمیت اس سے بغلگیر ہوگئے۔ ہم تینوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ نہ کوئی پارٹی نہ مٹھائی بانٹی گئی۔ لیکن انیق اسی محبت پر خوش ہوگیا۔ اس نے اس رول آف آنرز کو فریم میں لگا کے کسی دیوار پر نہ ٹانگا، صرف اپنے دل کی تختی پر کہیں چوری چوری آویزاں کرلیا اور بس!

سرد مہری کا ایک واقعہ اثیر خاں کے ساتھ بھی پیش آیا۔ وہ بنیادی طور پر کرکٹ کا کھلاڑی تھا۔ این ڈی ایف سی اور بہت سے بینکوں کے درمیان کرکٹ میچ کھیلے گئے۔ یہ اپنے بینک میں کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا۔ حسن اتفاق سے این ڈی ایف سی کی ٹیم سارے بینکوں سے مقابلہ جیت گئی۔ اثیر احمد خاں کو مین آف دی میچ کی ٹرافی ملی..... ایک بار وہ بھی ہاتھ میں لئے گھر پہنچا تو خاں صاحب تلقین شاہ لکھنے میں مصروف تھے.....

"ٹرافی ابو..... مین آف دی میچ" لیکن ابو لکھتے رہے۔ نظر اٹھائی نہ ٹرافی دیکھی۔ نہ مین آف دی میچ پر نظر ڈالی۔

"کتابوں کی الماری کے اوپر سجا دو۔" اثیر دل برداشتہ ٹرافی لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور ٹرافی کو اپنے پلنگ کے نیچے چھپا دیا.....

ہم اپنی Genes سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتے۔ کبھی کبھی ہمارے باپ دادا ہم میں سے اچانک برآمد ہو جاتے ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے ہمارا بس نہیں چلتا۔ خوشی کے موقعوں پر اسی طرح کہیں سے بابا جی محمد خاں اشفاق کی شخصیت کو Take over کرلیتے تھے۔

خان صاحب بتایا کرتے تھے کہ بابا جی میں ڈھکا چھپا غصہ بمقدار وافر تھا۔ کوئی انہیں خوشی کا اظہار کرتا نظر آتا تو غصے میں آجاتے۔ ایک روز خاں صاحب کے بڑے بھائی اسحاق احمد خاں سکول سے انعام لے کر آئے۔ بابا جی پھلوں کی ڈھیریاں پیک کروا رہے تھے۔

"یہ دیکھئے بابا جی! سکول سے مجھے فرسٹ آنے پر انعام ملا ہے۔"

بابا جی نے آنکھ اٹھا کر بھی انعام پر نظر نہ ڈالی اور بولے: "ججو! مجھے افسوس ہے تم انعام لینے والے ہو..... کاش تم انعام دینے والے ہوتے تو مجھے خوشی ہوتی....."

انیق پی ایچ۔ ڈی کرگئے اور ایم۔ ایس۔ سی (سائیکالوجی) میں گولڈ میڈل حاصل کیا لیکن اس کی اصلی توجہ طلسم ہوشربا، عجائب الف لیلیٰ جیسی کتابوں پر مرکوز ہوگئی۔ وہ انجانے میں معلوم سے زیادہ نامعلوم، شعور سے آگے لاشعور اور منطق سے نکل کر روحانیت کی طرف مائل ہوگیا۔ پھر سونے پر سہاگہ وہ محفلیں ہوئیں جب خاں صاحب واصف علی

واصف کی محفلوں میں جانے لگے۔ تین سال انیق ہر رات اپنے ابو جی کے ساتھ رات گئے تو واصف صاحب کی محفل میں شرکت کرتا رہا۔ اس کا وہ شوق جو Para- Psychology پر منتج ہوا' ان راتوں سے ہی شروع ہوا۔

انیس کے لیے تعلیم بہت مشکل تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج میں کلاسوں کے بجائے باہر Oval میں بیٹھا رہتا۔ گھر لوٹنے کا وقت آتا تو عموماً چپ چاپ بس لے کر گھر لوٹ آتا۔ اس کی سعادت مندی کا یہ عالم تھا کہ اس نے کسی سے کوئی مدد مانگی نہ ہی اعانت چاہی۔ وہ بچپن سے باپ پرست تھا۔ ان کے سارے کام کر کے راحت محسوس میرے بچوں میں ایک وہی ہے جو بازار سے سودا سلف بھی لے آتا۔ ابو کے پروگرام "تلقین شاہ" کی ریکارڈنگ بھی ذمہ داری تھی۔

اثیر نے سکول سے ہی کلاسوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ بمشکل تمام دسویں جماعت کی اور ماڈل ٹاؤن کے ہی داخلہ لے لیا' لیکن ایف اے کے امتحان سے چند مہینے پہلے اس نے کالج بھی چھوڑ دیا اور پرائیویٹ ایف اے کے لیے آرٹس میں ٹیوشن رکھ لی۔

ٹیوٹر بھی وہ اپنی پسند سے گھر لے آیا۔ امجد ٹیوٹر کم تھا اور دوست زیادہ۔ ہمارے گھر ہی منتقل ہو گیا اور اثیر لائبریری میں بیٹھ کر پڑھانے لگا۔ بدقسمتی سے اسے اچھی اپنے مستقبل کی فکر اثیر کی پڑھائی سے زیادہ تھی۔ اس نے ہاں رہ کر Lums کے کمپیوٹر کورس کیے۔ اپنے لیے ایک مشین بنائی جو انٹرنیٹ کی کاپی تھی اور اس پر زیادہ توجہ دینے لگا۔

گورنمنٹ کالج میں میرے کسی بیٹے کو میرٹ پر داخلہ نہ مل سکا' لیکن ان میں موسیقی کا شغف قدرتی تھا توسط سے انہیں داخلے ملے اور تینوں نے بی اے گورنمنٹ کالج سے کیے۔

طبلہ بجانے کے لیے انیق کو ایک ماسٹر نوکر دیا تو وہ ماسٹر بھی قریباً سارا دن گھر پر رہنے لگا۔ انیق تو طبلہ سیکھتے ہی تھے لیکن اثیر بیٹے نے سن سن کر ہی اس میں مہارت حاصل کر لی۔ جب انیق امریکہ سدھارے تو حبیب محمد کے ساتھ نیو یارک میں ایک سٹیج شو میں ان کی سنگت کی تھی اور انہیں خوب سراہا گیا تھا۔

بی اے میں انیق نے اثیر کی طرح سے ٹیوشن اختیار کر لی اور چونکہ اس کا مضمون بھی نفسیات تھا اثیر میاں کو اس مضمون میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ بی اے کے بعد اثیر نے G.R.E کا امتحان دیا۔ پرچے خوب ہوئے خیال تھا کہ وہ کسی فارن یونیورسٹی میں پڑھنے چلا جائے گا لیکن جی آر ای کے پرچے گم ہو گئے اور اس طرح ایک بار تعلیم سے متنفر ہوا۔

اگر انیق اپنی صلاحیتوں کے مطابق ڈاکٹر بن جاتا تو اس انسانیت پسند کا کیریئر مختلف ہوتا۔ یا اگر وہ موسیقی سے وابستہ ہو جاتا تو شاید؟

انیس انجینئر تھا۔ اسے عمارتیں ابھارنے کا شوق تھا' لیکن اس نے باپ کے فیصلے سے مارے باندھے اے کر لیا..... برس ہا برس Frustration کا ذکر میں تفصیل سے اس لیے نہیں کر سکتی کیونکہ پھر یہ کتاب ایک دوسری ہو جائے گی۔ مجھے تو یہاں صرف اپنی اور خاں صاحب کی غفلت کے باعث جو نتائج نکلے' ان کا ذکر کرنا ہے۔

اثیر نے بھی مارے باندھے فنانس میں ماسٹر کر لیا۔ اس کے علاوہ اس نے ہمیں خوش کرنے کے لیے

میں بھی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرلیں' لیکن اٹھیر سپورٹس مین تھا' اگر وہ کرکٹ میں چلا جاتا یا فلائنگ جس کا
رہتا' تو شاید اس میں پروفیشن کا درست چناؤ تحریک اور خوداعتمادی کا باعث بنتا۔ ہم دونوں نے ان کے
بچپن ان کی اصل مدد نہ کی۔

عہد کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ماں باپ بچوں کو دھونس سے اپنی مرضی کی ڈگریاں دلوا رہے ہیں لیکن کچھ
انجینئروں کی ایک پوری کھیپ راستہ بدل کر کبھی ایم بی اے کرنے نکل جاتی ہے' کسی کو بزنس کلاس اپنی
تی ہے۔ ماں باپ میں وہ وسعت قلب یا وسعت نظر نہیں ہوتی جو بچوں کے رجحان' صلاحیت اور ارادوں
جس پر چڑھ کر بچہ اپنے خوابوں تک پہنچ سکے۔

بچوں نے بظاہر دنیا جیت لی لیکن وہ اپنے اندر چپ اور اداس رہتے چلے گئے۔ میں بھی ایک ایسی
کی تربیت اور تعلیم دونوں ٹھگ بازی تھیں۔ میں صرف pamper کرنے کو خوبی سمجھتی تھی۔ میں ان کو ہوم
بجائے ان کا ہوم ورک کرنے کی عادی تھی۔ یہ تینوں اپنے آبائی لوگوں کی طرح بے حد شریف اور غیرت
نے نہ کبھی ہم سے گلہ کیا نہ کبھی دست سوال ہی دراز کر کے اپنے آپ کو شرمندہ کیا۔

کچھ دیر توقف کر کے ایک نتیجہ اخذ کرنے کی اجازت دیجیے۔

ب جو تجزیہ پیش کرنے لگی ہوں وہ علم کی بنا پر نہیں' تجربے کے طور پر میں نے زندگی سے سیکھا ہے۔

پ کو سائیکالوجی کی کتابوں میں دانا اور دانشور لوگوں کے علم سے انسان کے متعلق محیر العقول انکشافات مل
خیال ہے کہ انسان کو یقیناً اس کی جبلت اور بچپن کا ماحول پروان چڑھانے اور شخصیت ڈھالنے میں بہت
لیکن اس سے بڑی ایک اور بارش بھی ہے جو اللہ کی توفیق کی صورت میں اس پر برستی ہے' لیکن اس توفیق
نے کا ایک ٹونا ہے۔

میاں اپنی مرضی سے نہ کسی شخص کا فیصلہ بدلتا ہے نہ اس کی تجویز میں حارج ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ انسان اور اللہ
رت آدم نے جنت سے نکلتے وقت حضرت انسان کی طرف سے کرلیا تھا۔ اگر فرد دعا کا سہارا لے کر اللہ سے
رہو تو پھر اس کے ماحول' جبلت' سوچ' عمل اور رویے میں تبدیلی آنے لگتی ہے۔ شاید اسی لیے لوگ ماں کی
قدر وثوق سے آرزو کرتے ہیں۔ اپنا آپ اللہ کی رحمت کے حوالے کرنے کے بعد دنیا کو بدلنے کے
ہوتے ہی ہیں' انسان خود بھی تبدیل ہونے لگتا ہے۔

ت دان' Analyst اور Psychiatrist جہاں پہنچ کر بے بس ہو جاتا ہے' دعا سے وہی مقام پل جھپکتے
ن جاتا ہے۔ غریبی کے اپنے بکھیڑے ہیں' لیکن امیری بھی کچھ پھولوں کی سیج نہیں۔ یہاں وہاں مسائل
ہے۔ مسائل ختم نہیں ہوتے۔ انسان کو جس اطمینان قلب کی ضرورت ہے' اپنی ذات کی جس تبدیلی سے اسے
کرسکتی ہے۔ وہ سوائے اوپر والے کے اور کہیں سے نہیں مل سکتی اور اللہ بھی آرزومند ہے کہ ہم اس سے
اس کے کوئی اور دروازہ نہ کھٹکھٹائیں۔

شرک سے نکل جانے والے کے لیے دونوں جہاں میں پناہ ہے۔ وہ نہ صرف اداسی' بددلی اور بدحوصلگی

سے نکل جاتا ہے' بلکہ صرف اللہ سے مانگنے والے اس درجہ مضبوط' خود کفیل اور استقامت پسند ہوتے ہیں کہ پھر ... سے خوف نہیں آتا اور اس کی اس تبدیلی سے کئی بدنی' ذہنی' عقلی تبدیلیاں خود بخود اس کا نصیب بن جاتی ہیں۔

لیکن یہاں پہنچ کر پھر توقف کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی دعا بھی کارگر نہیں ہوتی اور ... برس اس ریاضت کا سہارا لے کر بددل ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایک مرتبہ مانگی دعا قبول ہو جاتی ہے اور سارے ... جاتے ہیں۔ انسان کا علم قلیل ہے اور جتنے نفوس ہیں' اتنے راستے اللہ کی طرف جانے اور اطمینان پانے کے ... مگر مجھے یہی راستہ سمجھ میں آیا ہے یعنی ہاتھ باندھ کر یقین محکم کے ساتھ اللہ کے حضور دعا مانگنے والا عموماً خالی ... لوٹتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خاں صاحب کا خاندان موروثی اور جبلتی طور پر گونگا ہے۔ یہ غم کا اظہار واویلا ڈال کر نہیں کرتے نہ محبت ... ہی کو ظاہر کرنے کے لیے تالیوں' قہقہوں یا چیخوں کا سہارا لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے ان کو عموماً ایسے جیون ساتھی ملے جو ... جذبات کا برملا اظہار کرتے تھے۔

جب اسحاق بھائی ایئر فورس چھوڑ کر مزنگ روڈ میں آ بسے تو پہلا شدید ردعمل ذکیہ اور اماں جی میں اسی ... بدولت پیدا ہوا۔ ذکیہ جی نے واصف کی سالگرہ منانے کا پروگرام بنایا۔ یہ سالگرہ کچھ آج جیسی پر بہار دعوت نہ ... منانے اور سجانے کا اہتمام کچھ کم نہ تھا۔ ہم بھی ایک معمولی سا تحفہ لے کر پہنچ گئے۔ باباجی کے ملحق لمبے کمرے میں ... کیک پر موم بتیاں روشن تھیں۔ گھر کے دوسرے افراد باجی ضیا' بالو بھائی اور بچے موجود تھے۔

آفتاب بھائی اور خالد میاں بھی کچھ پریشان کچھ محجوب سے کھڑے تھے۔ اماں جی بار بار چہرہ پونچھتی ... اپنی ناخوشی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جو بھائی بھی At ease نہ تھے..... لیکن سب سے بڑی بات کہ ذکیہ ... انفرمیشن کے باوجود باباجی محمد خاں عین بروقت گھر سے نکل گئے..... اس کا ملال ذکیہ جی کو برسوں رہا لیکن ... کی حالت دیکھ کر نصیحت پکڑی کہ پھر کبھی بچوں کی سالگرہ منانے کی کوشش نہ کی۔

میری بیچاری بڑی بہو غزل کو بھی ایک تجربے سے گزرنا پڑا۔ اس نے اپنی بیٹی ارشیا کی سالگرہ بڑی ... منانے کی کوشش کی۔ دیگیں پکوائیں' بڑا سا کیک بتیوں سمیت میز پر حاضر تھا۔ کھانے اور چائے دونوں کا ... (غزالہ) غزل ایک زندہ دل ہنستے کھیلتے گھرانے کا فرد تھی۔ وہ بندشی کا فلسفہ نہ جانتی تھی۔ محبت کا اظہار اور گرم ... کے لیے نیچرل تھی۔

جب میز سج گئی۔ بتیاں روشن ہو گئیں۔ سب تالیاں بجانے اور ہیپی برتھ ڈے گانے کے لیے میز کے ... گئے تو انیق کو جاناں' جاناں کہہ کر غزل تلاش کرنے لگی..... کمروں میں لان پر سب جگہ تلاش کیا گیا..... لیکن جاناں ... انیق اس وقت لوٹے جب برتن واپس باورچی خانے میں جا رہے تھے۔

انیس بیٹا اپنی کارکردگی دکھانے اور اس پر داد حاصل کرنے میں نہیں پڑتا تھا۔ کام بھی اس طرح کرتا ... شرمندہ کرنے کی نوبت نہ آئے۔ اسی کے گرد ہولے ہولے 121۔ سی میں دوستوں کا مجمع اکٹھا ہونے لگا' لیکن دوست ... اس گھر میں وہ بھائیوں کے ساتھ شیئر کرتا۔

ذویڈنل پبلک سکول سے اس کے ساتھ قاسم ادریس اور وسیم قاضی آنے لگے۔ یہ بچوں کی سعادت مندی ہے کہ کھیل کود اور گپ شپ کو ماں باپ کے ضروری کاموں میں مخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ کبھی کبھی راتوں کو یہ باہر نکل جاتے۔ تب ہی انھوں نے روحی کی فوکسی کار چلانی سیکھی۔ جب روحی باجی ان کے کمرے میں سو جاتی تو نکلتے۔ کار چراتے اور باہر نکل جاتے۔ ان دنوں شہر میں امن تھا۔ گیٹ کو تالا لگانے کا رواج نہ تھا۔

سب سے پہلے انیس نے ڈرائیونگ سیکھی۔ اس کے بعد باری باری سب کا جھاکا کھلا۔ جب کبھی ثاقب شہاب قیام کرتا تو رات کو یا تو آموں کی پیٹیوں سے آم چرائے جاتے یا باورچی خانے کا دروازہ بند کر کے ان سے کھوا جاتا۔ نبیل اشتیاق کو انڈوں کا شوق تھا۔ جب کبھی وہ ہمارے گھر شب بسری کرتا، خوب خوب انڈے تلے جاتے۔ گھر نہ ہوتے تو چپکے ڈبل کر کے انڈے لائے جاتے۔

میں تصدیق کرتی ہوں عموماً ماں باپ اولاد کے حق میں جو کچھ بھی کرتے ہیں اس کے متعلق بچے اچھی رائے نہیں رکھتے۔ اس سلسلہ میں خان صاحب نے اپنی سی کوشش ضرور کی۔ جب انیق پروفیسر ہوئے تو فوکسی کا ڈبہ اسے دے دیا کہ شوق تھا۔ اسی ڈبے پر انیق اپنے شاگرد بٹھا کر گھر لاتے۔ ان کی مفت ٹیوشن کرتے۔ گھر پر کھانا کھلاتے اور پھر انھیں لوڈ کر کے واپس کالج چھوڑ آتے۔ گرو چیلے کی ایک اچھی مثال انیق بیٹے نے اپنے شاگردوں کو پیش کی اور ابھی انیق خاں کو امریکہ ہجرت کیے پندرہ سال ہو گئے ہیں ان کے بعض شاگرد ان کے ساتھ رابطے کیے ہوئے ہیں۔

انیس جب پی آئی اے میں ملازم ہو کر کراچی سدھارے تو ابو نے اپنی فوکسی اسے بھجوا دی۔ یہ ضرور ہے کہ وہ پی آئی اے کے ملازم تھے اور انہیں سرکاری گاڑی ملی ہوئی تھی، لیکن وہ چاہتے تو فوکسی کو گھریلو استعمال میں رکھ سکتے تھے۔

سب سے لاڈلی اثیر نے جب بی اے کے بعد ایک "میڈاس" (Midas) نامی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازمت کر لی تو خان صاحب نے اس کی عزتِ نفس کو بھائیوں کے مقابلے میں قائم رکھنے کے لیے ایک سیکنڈ ہینڈ موریس خرید کر دی اور اثیر اس پر اپنے کام پر جانے لگا..... اس زمانے میں ایسی فراخ دلی ہمارے عزیزوں میں کسی نے بھی اولاد کے لیے نہ کی تھی۔ خاندان میں چرچے ہوتے کہ شفو غلط مثال قائم کر رہا ہے اور اپنے بچوں کو بگاڑ رہا ہے۔

بہرکیف اسی فوکسی ڈبے پر ان بچوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ جادو کی سفر بھی کیے۔ یہ پروگرام ہم سے چھپ کر بنایا گیا۔ لیکن آخر اجازت طلب کرنے کے لیے انیق کو ابو کے سامنے پیش ہونا پڑا..... رات کے وقت خاں صاحب نے مجھ سے کہا..... "قدسیہ ایک مشکل ہے" میں گھبرا گئی۔

"جی؟"

"بچے فوکسی ڈبے پر خیرا گلی جانا چاہتے ہیں۔"

"تو جانے دیں..... جی" میں نے ہمیشہ کی طرح بے سمجھی سے کہا۔

"خیر ٹھہرنے کا انتظام تو ہو جائے گا۔ وہاں اپنا چھوٹا سا بیرک نما گھر ہے..... ٹھیکیدار ان کا خیال بھی رکھے گا.....

"جی لیکن کیا؟"